انتخاب کلام

خلیل الرحمٰن اعظمی

مرتبہ

شہریار

اتر پردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

سلسلۂ مطبوعات: ۳۲۸

انتخاب کلام

خلیل الرحمٰن اعظمی

مرتبہ

شہریار

اتر پردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

© اتر پردیش اردو اکادمی

انتخاب کلام خلیل الرحمٰن اعظمی

مرتبہ: شہریار

پہلا ایڈیشن	۱۹۹۱
تعداد	ایک ہزار
قیمت	دس روپے

جگدیش چندر وَدھاوَن، سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ ضلع فیض آباد سے چھپوا کر بلبیرہ ہاؤس، قیصر باغ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱ سے شائع کیا۔

پیش لفظ

کسی زبان کی سطح ارتقا کو سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی کس درجہ صلاحیت رکھتی ہے، جدید علوم وفنون اور جدید افکار ونظریات کے ابلاغ وترسیل کے لیے اس کی لفظیات کہاں تک کفالت کرتی ہے۔ اس بات کا ادراک بڑی حد تک اس زبان میں شائع ہونے والی کتابوں کی کیفیت، کمیت اور موضوعات کے تنوع سے ہو سکتا ہے۔

دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی تاریخ کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اردو کو ایک باضابطہ زبان کی شکل اختیار کیے ہوئے بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔ پھر بھی، دوسری زبانوں سے استفادے کے تئیں اس کی وسیع القلبی کی بدولت یہ قابلِ لحاظ لفظی سرمایے کی مالک بن چکی ہے۔ البتہ اردو میں سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات کی کمی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ کچھ ادارے اصطلاحات سازی کی طرف خاطر خواہ توجہ کر رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں معلوم ہوتا جب اس کمی کا احساس بھی ختم ہو جائے گا۔

اتر پردیش اردو اکادمی کے بنیادی مقاصد میں اشاعت کتب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس مقصد کے حصول کی جانب اکادمی نے کتنی توجہ کی ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج اکادمی کا شمار صفِ اول کے اردو ناشرین میں ہوتا ہے۔

اشاعتِ کتب کا یہ سلسلہ سلسل جاری ہے۔

زیرِ نظر کتاب 'انتخاب کلام خلیل الرحمٰن اعظمی' مطبوعات اکادمی کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ اکادمی کی شائع کردہ دوسری کتابوں کے مانند اس کتاب کو شرف قبول حاصل ہوگا۔

اتر پردیش اردو اکادمی،
لکھنؤ۔

محمد یونس نگرامی
چیرمین مجلس انتظامیہ

ترتیب

انتخاب از کاغذی پیرہن ۳

نظمیں

میرا گھر میرا ویرانہ ۱۵
آپ بیتی ۱۷
کاغذی پیرہن ۲۲
نیا جنم ۲۵
کنج محبت ۲۹
بہار کی واپسی ۳۰

غزلیں

بہت فسردہ ہیں ان کو کھو کر جگر فگاروں سے کچھ نہ کہنا ۳۲
گلی گلی کی ٹھوکر کھائی کب سے خوار و پریشاں ہیں ۳۳
زہر پی کر بھی یہاں کس کو ملی غم سے نجات ۳۵
تمام یادیں مہک رہی ہیں ہر ایک غنچہ کھلا ہوا ہے ۳۶

انتخاب از نیا عہد نامہ ۳۹

غزلیں

وہ دن کب کے بیت گئے جب دل سپنوں سے بہلتا تھا ۴۱
ہنگامۂ حیات سے جاں بر نہ ہو سکا ۴۳
بہت دنوں میں نے کنج خلوت میں اپنی آواز ہی سُنی ہے ۴۴
کوئی تم جیسا تھا ایسا ہی کوئی چہرا تھا ۴۵
پینا نہیں حرام ہے زہرِ وفا کی شرط ۴۷
تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے ۴۹
وہ رنگ رخ، وہ آتشِ خوں کون لے گیا ۵۰
کہوں یہ کیسے کہ جینے کا حوصلہ دیتے ۵۱
میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں ۵۳

نظمیں

بن باس ۵۵

سایۂ دیوار ۵۸
اپنے بچّے کے نام ۶۰
شام ۶۲
رفتگاں ۶۳
سوداگر ۶۵
نیا عہدنامہ ۶۶

انتخاب از زندگی اے زندگی ۶۹

غزلیں

خود اپنا عکس ہوں کہ کسی کی صدا ہوں میں ۷۱
سوتے سوتے چونک پڑے ہم خواب میں ہم نے کیا دیکھا ۷۲
ہر ہر سانس نئی خوشبو کی اک آہٹ سی پاتا ہے ۷۳
ہر گھڑی عمر فرومایہ کی قیمت مانگے ۷۴
کیا قیامت ہے کہ ہم خود ہی کہیں خود ہی سُنیں ۷۵
بنے بنائے سے رستوں کا سلسلہ نکلا ۷۶
کیوں میں بے حس بن کے اوروں کی طرح سے زندہ ہوں ۷۷

نظمیں

حروف و الفاظ کے ذخیرے ۷۸
میں گوتم نہیں ہوں ۸۰
آئینہ در آئینہ ۸۲

غزلیں

میں کہاں ہوں کچھ بتا دے زندگی اے زندگی ۸۴

پھر مری راہ میں کھڑی ہوگی ۸۶

اگرچہ غیر کے ہاتھوں لہولہان ہوا ۸۷

مقدمہ

خلیل الرحمن اعظمی کی وفات پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کسی نے کہا تھا کہ وہ اپنی شاعری میں جن قدروں کی ترجمانی کرتے رہے زندگی سے موت تک کا سفر انھوں نے انھیں کے سہارے طے کیا۔ زندگی اور شاعری میں قدروں کا اتنا اور ایسا پاس ہمیں خال خال نظر آتا ہے۔ ہم بار بار اس کا اظہار کرتے ہیں کہ آج کی شاعری قدروں کی شکست و ریخت سے عبارت ہے یہ کون سی اقدار ہیں اس کی وضاحت نہیں کرتے اور وہ شاعری اور ادب ہماری توجہ نہیں کھینچتا جس کے وسیلے سے ہم قدروں کی وضاحت کر سکتے ہیں۔

جدید تنقید شاعری کو شاعر سے الگ کر کے دیکھتی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ میرا جی، ناصر کاظمی اور خلیل الرحمن اعظمی کی قدر و قیمت کے تعین کے سلسلے میں اپنی نیک نیتی کے باوجود انصاف نہیں کر سکی ہے۔ میرا جی اور ناصر کاظمی اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ ان کو ارادت مندوں کا ایک فعال حلقہ میسر تھا۔ خلیل الرحمن اعظمی عصری ادب پر اپنے تنقیدی خیالات کی وجہ سے اس سے محروم رہے۔

فن کی مثالی شکل وہی ہے جو فنکار کی ذات اور اس کے عہد سے اپنا خود مکتفی اور الگ وجود رکھتی ہو لیکن دنیا کے ادب میں ایسی مثالیں بھی کافی ہیں جہاں فن اور فنکار ایک دوسرے کے حوالے کے محتاج رہے ہیں اور ان کی تشکیل ایک خاص دور کی ممنون رہی ہے اُردو میں میر کی شاعری اس کی بہت بڑی مثال ہے۔ میر کی شاعری سے ان کی ذات کو اور دونوں کو ان کے عہد سے الگ کر کے جو ہم پاتے ہیں وہ بہت کم ہے اور جو کھوتے ہیں وہ بہت زیادہ ہے۔ میر پر اچھے مقالے انھیں لوگوں نے پیش کیے ہیں جو اس نکتے کو پا گئے ہیں۔ شخصیت کا شاعری سے اور دونوں کا عہد سے جو تعلق ہوتا ہے اس کی نوعیت بڑی پیچیدہ ہوتی ہے یہ بات ہمارے ذہن میں ہمیشہ رہنی چاہیے۔

خلیل الرحمن اعظمی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں مذہب بلکہ مولویت کا رنگ گہرا تھا۔ فن کی بنیاد انکار ہے اس لیے انھوں نے اس ماحول سے بغاوت کی۔ یہ بغاوت مذہب اور اس کی اقدار سے نہیں تھی بلکہ اس کی اس شکل سے تھی جو حقیقت اور صداقت کی تلاش میں مانع تھی۔ حقیقت اور صداقت کی تلاش کا یہ عمل اعلیٰ انسانی قدروں کی بازیافت، ان کے تحفظ کے لیے تھا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل میں دنیا سے ٹکراؤ ناگزیر تھا، نتیجے کے طور پر ذات کی طرف مراجعت اور پھر ذات میں نت نئے تناؤں کا آغاز۔ ٹکراؤ، مراجعت اور تناؤ کے مختلف مرحلوں کو فن کی شکل دینے کی جد و جہد خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری کا بنیادی سروکار ہے۔ اس جد و جہد میں وہ اپنے زمانے اور اپنی ذات سے فاصلہ اختیار کرنے کے باوجود معروضی نہیں ہو پاتے۔ اسی لیے ان کے شعری تجربے اقداری فیصلوں سے لبریز ہیں۔ ان کے شعری تجربوں میں ہماری شرکت اختلاف یا اتفاق کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ادب میں یہ مرحلہ بہت دشوار ہوتا ہے۔ معروضیت اور غیر جانبداری کے تمام دعووں کے باوجود زندگی کے تئیں ہم داخلی ہی ہوتے ہیں اور جانبدار بھی۔

خلیل الرحمن اعظمی صدیوں سے پرانے حسّاس انسان کی طرح ایک مثالی زندگی کے خواب دیکھتے تھے۔ انسان کی بے حسی، خود غرضی، بے بسی اور بیچارگی ان کے دل اور ذہن دونوں کو بے چین کر دیتی ہے اور گرد و پیش کی دنیا انھیں اجنبی لگنے لگتی ہے۔ انسان کے مستقبل اور مقدر کے بارے میں ان کے دل میں ایسے وسوسے پیدا ہوتے ہیں جو اپنے آخری تجربے میں بڑے ہولناک ہیں۔ ان کو یہ بات بہت پریشان کرتی ہے کہ انسان نے جانتے بوجھتے اپنے لیے ایسے راستے منتخب کیے ہیں جن کی منزل خود تخریبی ہے۔ جس انہماک اور تندہی سے وہ اس خود تخریبی کی تیاری میں مصروف ہے۔ اس کا غم انگیز اور اداس کر دینے والا اظہار خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری کا بنیادی جوہر ہے۔ تیز رفتاری اور سہولیت اور آسائشوں پر یقین رکھنے والے معاشرے کو یہ رویہ خوش نہیں آتا وہ اس رویے کو رد کرنے کے لیے نئے نئے اسباب تلاش کرتا ہے۔ کبھی قنوطیت کا نام دے کر اور کبھی رجعت پسندی کا الزام لگا کر:

اپنا مشاہدہ نہیں کرتے سیاہ رو
وہ دیکھے آئینہ کہ جو روشن ضمیر ہو

خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری پر میر کے اثرات کی نشاندہی کرنے یا خود رحمی اور قنوطیت کا سراغ لگانے والے اکثر نقاد معاشرے کے اسی رویے کو ظاہر کرتے ہیں۔ آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم تخلیقی ادب کا براہِ راست مطالعہ کریں۔ ہماری تنقید تخلیقی ادب کے سلسلے میں بہت سرسری اور سہل پسندی کا شکار ہے اور اچھے اور سچے ادب سے ہماری لطف اندوزی میں معاونت کرنے کی جگہ مانع آتی ہے مستثنیات کی بات الگ ہے۔

خلیل الرحمن اعظمی کے تین مجموعے شایع ہوئے ہیں دو ان کی زندگی میں اور تیسری ان کی وفات کے بعد۔ پہلے مجموعے (کاغذی پیرہن) میں جذبات اور احساسات کی شدت ہے۔ ہیئت اور اسلوب کی دروبست کے مقابلے میں تجربے کے پراثر اظہار پر توجہ ہے۔ موضوعات اور مسائل نسبتاً سادہ اور معصوم ہیں ان کے سچے ہونے میں کلام نہیں ان کا مطالعہ اسی روشنی میں کرنا چاہیے۔

دوسرے مجموعے "نیا عہد نامہ" میں پیچیدگی اور تہہ داری کا عنصر زیادہ ہے۔ یہاں فن، شخصیت اور عہد باہم مربوط نظر آتے ہیں۔ زندگی کے متنوع تجربات نے جذبات میں ایک نوع کا ٹھہراؤ اور ضبط پیدا کر دیا ہے۔ محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ سوچنے کا عمل نمایاں ہے۔ تیسرا مجموعہ "زندگی اے زندگی" ان کی وفات کے بعد شایع ہوا ہے اس میں وہ کلام بھی شامل ہے جو انھوں نے بیماری کے دنوں میں لکھا۔ بظاہر وہ اپنی بیماری کی نوعیت سے بے خبر تھے لیکن بیماری کے دنوں کے کلام سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موت کی سرگوشیوں کو سن رہے تھے اور اس کو اپنے آس پاس منڈلاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ تینوں مجموعوں سے ایسی چیزیں منتخب کی جائیں جو خلیل الرحمن اعظمی کے فن اور شخصیت کے ارتقا کو سمجھنے میں مدد

دیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس میں ان کے اچھے کلام کا بڑا حصہ آجائے۔ کسی بھی انتخاب میں پوری غیر جانبداری ممکن نہیں ہے۔ میں خلیل الرحمن اعظمی کے اتنے قریب تھا کہ اس کو فاصلے سے دیکھنا میرے لیے ممکن نہیں۔ غیر جانبداری تو بڑی بات ہے۔ اس انتخاب کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھیے۔

اترپردیش اکیڈمی خلیل الرحمن اعظمی شناسی میں پیش پیش رہی ہے یہ انتخاب بھی اسی کا ایک ثبوت ہے۔

شہریار

انتخاب از

کاغذی پیرہن

باب الخامس

[illegible]

انتخاب از "کاغذی پیرہن"

میرا گھر، میرا ویرانہ

دیدنی ہے یہ مرا گھر، مرا ویرانہ بھی
اس گذرگاہ پہ کچھ دیر ٹھہر جا سیّاح
مجھ کو معلوم ہے تو سارا جہاں دیکھ چکا
ہاں اُفق تا بہ اُفق ساری زمیں دیکھی ہے
تو نے ایوان بھی دیکھے ہیں کھنڈر بھی دیکھے
وادیاں دیکھیں پہاڑوں کی جبیں دیکھی ہے
میری دنیا بھی ذرا دیکھ کہ اِس دنیا کو
دیکھنے والوں نے اب تک کبھی دیکھا ہی نہیں
میں فسانہ ہوں، کوئی چاہے تو مجھ کو لکھ لے
پر مرا حال کسی نے کبھی پوچھا ہی نہیں
تجھ کو اے دوست! دکھاؤں کہ کہاں رہتا ہوں
یہ وہ گھر ہے کہ جو شاید کبھی ہو سکتا تھا گھر
تجھ کو شاید نہ نظر آئے مگر یہ سچ ہے
اس کے سینے میں ہیں پوشیدہ مرے لعل و گہر

یہ زمیں اجڑی ہوئی، ٹوٹی ہوئی ہے دیوار
پر اسی کوکھ میں دھرتی کی ہے سرمایہ مرا
میں جو اس وقت نظر آتا ہوں یہ میں نہیں ہوں
میری تصویر ہے دھندلا سا ہے یہ سایہ مرا
اس میں ہیں میری محبت کے وہ سارے ارماں
جن سے محروم رہا میرا یہ بیدار شباب
اس میں ہیں میری کتابیں کہ جو لکھی نہ گئیں
اس میں ہیں میرے وہ اشعار نہیں جن کا جواب

آپ بیتی

یوں تو مرنے کے لیے زہر سبھی پیتے ہیں
زندگی تیرے لیے زہر پیا ہے میں نے
شمع جلتی ہے پر اک رات میں جل جاتی ہے
یاں تو ایک عمر اسی طرح سے جلتے گزری
کون سی خاک ہے یہ جانے کہاں کا ہے خمیر
اک نئے سانچے میں ہر روز ہی ڈھلتے گزری
کس طرح میں نے گزاری ہیں یہ غم کی گھڑیاں
کاش میں ایسی کہانی کو سنا بھی سکتا
طعنہ زن ہیں جو مرے حال پہ اربابِ نشاط
ان کو اک بار میں اے کاش رلا بھی سکتا
میں کہ شاعر ہوں، میں پیغامبرِ فطرت ہوں
میری تخییل میں ہے ایک جہان بیدار
دسترس میں مری نظارۂ گلہائے چمن
میرے ادراک میں ہیں کن فیکون کے اسرار
مرے اشعار میں ہے قلب حزیں کی دھڑکن
میری نظموں میں مری روح کی دل دوز پکار

پھر بھی رہ رہ کے کھٹکتی ہے مرے دل میں یہ بات
کہ مرے پاس تو الفاظ کا اک پردہ ہے
صرف الفاظ سے تصویر نہیں بن سکتی
صرف احساس میں حالات کی تفسیر کہاں
صرف فریاد میں زخموں کی وہ زنجیر کہاں
ایسی زنجیر کہ ایک ایک کڑی میں جس کی
کتنی کھوئی ہوئی خوشیوں کے مناظر پنہاں
کتنی بھولی ہوئی یادوں کے پُراسرار کھنڈر
کتنے اجڑے ہوئے، لوٹے ہوئے سنسان نگر
کتنے آتے ہوئے جاتے ہوئے چہروں کے نقوش
کتنے بنتے ہوئے مٹتے ہوئے لمحات کا راز
کتنی الجھی ہوئی راہوں کے نشیب اور فراز

۲

کیا کہوں مجھ کو کہاں لائی مری عمرِ رواں
آنکھ کھولی تو ہر اک سمت اندھیرے کا سماں
رینگتی اونگھتی مغموم سی اک راہ گزار
گردِ آلام میں کھویا ہوا منزل کا نشان
گیسوئے شام سے لپٹی ہوئی غم کی زنجیر
سینۂ شب سے نکلتی ہوئی فریاد و فغاں

ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہواؤں میں وہ غربت کی تھکن
در و دیوار پہ تاریک سے سائے لرزاں
کتنی کھوئی ہوئی بیمار و فسردہ آنکھیں
ٹمٹماتے سے دیئے چار طرف نوحہ کناں
مضمحل چہرے مصائب کی گراں باری سے
دلِ مجروح سے اٹھتا ہوا غمناک دھواں
یہی تاریکیٔ غم تو مرا گہوارہ ہے
میں اسی کوکھ میں تھا نورِ سحر کے مانند
ہر طرف سوگ میں ڈوبا ہوا میرا ماحول
میرا اجڑا ہوا گھر میر کے گھر کے مانند
اک طرف عظمتِ اسلاف کا ماتھے پہ غرور
اور اک سمت وہ افلاس کے پھیلے ہوئے جال
بھوک کی آگ میں جھلسے ہوئے سارے ارماں
قرض کے بوجھ سے جینے کی امنگیں پامال
وقت کی دھند میں لپٹے ہوئے کچھ پیار کے گیت
مہر و اخلاص زمانے کی جفاؤں سے نڈھال
بھائی بھائی کی محبت میں نرالے سے شکوک
نگہ غیر میں جس طرح انوکھے سے سوال

"ایک ہنگامے پہ موقوف تھی گھر کی رونق"
مفلسی ساتھ لیے آئی تھی اک جنگ و جدال
فاقہ مستی میں بکھرتے ہوئے سارے رشتے
تنگدستی کے سبب ساری فضائیں بے حال
اک جہنمؔ کی طرح تھا یہ مرا گہوارہ
اس جہنمؔ میں مرے باپ نے دم توڑ دیا
ٹوٹ کر رہ گئے بچپن کے سہانے سپنے
مجھ سے منھ پھیر لیا جیسے مری شوخی نے
میرے ہنستے ہوئے چہرے پہ اداسی چھائی
جیسے اک رات بھیانک مرے سر پر آئی
راہیں دشوار مگر راہ نما کوئی نہ تھا
سامنے وسعتِ افلاک خدا کوئی نہ تھا
میرے اجداد کی میراث یہ ویران سا گھر
جس کو گھیرے ہوئے ہر سمت تباہی کے بھنور
جس کی چھت گرتی ہوئی ٹوٹا ہوا دروازہ
ہر طرف جیسے بکھرتا ہوا اک شیرازہ
نہ کہیں اطلس و کمخواب، نہ دیبا و حریر
ہر طرف منھ کو بسورے ہوئے جیسے تقدیر

مجھ کو اس گھر سے محبت تو بھلا کیا ہوتی
یاں اگر دل میں نہ جینے کی تمنا ہوتی
یہ سمجھ کر کہ یہی ہے مری قسمت کا لکھا
اُس کی دیوار کے سائے سے میں لپٹا رہتا
لیکن اس دل کی خلش نے مجھے بیدار کیا
مجھ کو حالات سے آمادۂ پیکار کیا
بے کسی رختِ سفر بن کے مرے ساتھ چلی
یاد آئی تھی مجھے گاؤں کی ایک ایک گلی
لہلہاتی ہوئی فصلیں، وہ مرے آم کے باغ
وہ مکانوں میں لرزتے ہوئے دھندلے سے چراغ
دور تک پانی میں پھیلے ہوئے وہ دھان کے کھیت
اور تالاب کنارے وہ چمکتی ہوئی ریت
میرے ہم عمر، وہ ساتھی، وہ مرے ہمجولی
میرے اسکول کے وہ دوست، مری وہ ٹولی
ایک بار ان کی نگاہوں نے مجھے دیکھا تھا
جیسے اک بار مرے دل نے بھی کچھ سوچا تھا
میں نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

کاغذی پیرہن

کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے موسم بدل رہا ہے
اٹھوں اور اب اٹھ کے کیوں نہ اس گھر کے سارے دروازے کھول ہی دوں
مرے دریچوں پہ جانے کب سے دبیز پردے لٹک رہے ہیں
میں کیوں نہ ان کو الگ ہی کر دوں
مرا یہ تاریک و سرد کمرہ
بہت دنوں سے سنہری دھوپ اور نئی ہوا کو ترس رہا ہے
جگہ جگہ جیسے اس کی دیوار کی سپیدی اکھڑ گئی ہے
ہر ایک کونے میں کتنے جالے لگے ہوئے ہیں
مرے عزیزوں، مرے رفیقوں کی یادگاریں
یہ ساری تصویریں جیسے دھندلی سی پڑ گئی ہیں
یہ شیلف جس میں مری کتابیں ہیں
میز، جس پر مرے سبھی کاغذات بکھرے ہوئے پڑے ہیں
یہ سب کے سب گرد سے اٹے ہیں
مری کتابیں،
میں کیا بتاؤں کہ کس قدر ہیں عزیز مجھ کو

بہت سی ایسی ہیں جو مرے دوستوں نے تحفے میں مجھ کو دی ہیں
وہ دوست جو جاں نثار تھے مرے، کس قدر چاہتے تھے مجھ کو
میں ان کے ہاتھوں کی پیاری تحریر ان کتابوں میں دیکھتا ہوں
کچھ ایسے الفاظ، ایسے فقرے
جو اُن کے ہاتھوں نے صرف میرے لیے لکھے ہیں
یہ میرے غمخوار، میرے دکھ درد کے امیں ہیں
مرے یہ سب کاغذات جو منتشر پڑے ہیں
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے میں ان سے بیزار ہو چلا ہوں
اگرچہ یہ جانتا ہوں ان کے سوا ہے کیا کائنات میری
مری تصانیف، میرے مضمون، میری نظموں کی ساری پونجی
وہ شے کہ جس کی نہ کوئی قیمت ہے اور نہ جو میرے کام آئی
مری کتابیں، مری بیاضیں، مسوّدے میری فکر و فن کے
نہ جانے کتنے ہی ناشروں کے حسین فائل میں کچھ دن رہ کے
پھر دوبارہ اس اُجڑے کمرے میں آ کے آباد ہو گئے ہیں
میں جس زمانے میں ان کتابوں کو لکھ رہا تھا
عجب جنون تھا
عجیب طوفان میرے دل میں امنڈ رہا تھا
نہ نیند آتی تھی رات کو اور نہ دن کو دم بھر سکون ملتا

کہ جیسے خود زندگی نے ہاتھوں کو میرے لوح و قلم دیا ہو
انھیں کتابوں میں
میرے دل کی تمام دھڑکن
مری تمنّا
مرے ارادوں کی ساری گرمی
مری محبت کے سارے نشتر چھپے ہوئے ہیں
میں آج ان کاغذات کو الٹ کر جو دیکھتا ہوں
تو اپنے ہی دل سے پوچھتا ہوں
یہ میری لکھی ہوئی کتابیں ہیں؟
ایسے اشعار؟
ایسی نظمیں؟
کہ جن پہ خود مجھ کو رشک آئے
یہ سب مرے ذہن کا کرشمہ ہیں؟ (ہائے کیا ہیں)
میں ان کو پہچانتا نہیں ہوں
یہ ساری تصویریں میری ایسی ہیں جو آج مجھ سے مختلف ہیں

نیا جنم

ابھی اک سال گزرا ہے، یہی موسم، یہی دن تھے
مگر میں اپنے کمرے میں بہت افسردہ بیٹھا تھا
نہ کوئی سانولے محبوب کی یادوں کا افسانہ
نہ ایوانِ زمستاں کی طرف جانے کی کچھ خواہش
کسی نے حال پوچھا تو بہت ہی بے نیازی سے
کہا "جی ہاں خدا کا شکر ہے" "میں خیریت سے ہوں
کوئی یہ پوچھتا کیوں آج کل کوئی غزل لکھی" ؟
نہ جانے بات کیا ہے ان دنوں کچھ ایسا لگتا ہے
تمھاری ہر غزل میں میرؔ کا انداز ملتا ہے
ہر اک مصرعے سے جیسے دھیمی دھیمی آنچ اٹھتی ہے
تمھارے شعر پڑھ کر جانے کیوں محسوس ہوتا ہے
کہ کوئی سازِ پُرمدھم سُروں میں گنگناتا ہے
مگر اک بات پوچھوں تم خفا تو ہو نہ جاؤ گے ؟
یہ آخر کیا سبب ہے آج کل نظمیں نہیں لکھتے
تمھاری آپ بیتی بھی ابھی تک نامکمّل ہے
اسے تو ناقدانِ فن نے سنتے ہیں سراہا ہے

میں سب سنتا مگر یہ دل ہی دل میں سوچتا رہتا
مرے احباب کیا جانیں کہ مجھ پر کیا گزرتی ہے
مرے افکار پہ یہ کیسی ویرانی سی چھائی ہے
بہت کچھ سوچتا ہوں پھر بھی اب سوچا نہیں جاتا
بہت کچھ چاہتا ہوں پھر بھی کوئی بس نہیں چلتا
مگر اس بے بسی میں بھی مرے دل کی یہ حالت تھی
کبھی جب کوئی اچھی چیز پڑھنے کے لیے ملتی
تو پھر دل زخم پہ اک وجد کی سی کیفیت ہوتی
رگوں میں میری جیسے خون کی گردش تیز ہو جاتی
لہو کا ایک اک قطرہ یہ کہتا میں تو زندہ ہوں
مری پامالیوں میں پل رہی ہے اک توانائی
یہی عالم رہا تو جانے میں کس روز اٹھ بیٹھوں
بسنت آیا تو یوں آیا کہ میں بھی جیسے اُٹھ بیٹھا
سویرا ہوتے ہی ہر سمت سے جھونکے ہواؤں کے
نئی خوشبو لیے مجھ کو جگانے کے لیے آئے
جدھر بھی آنکھ اٹھاتا ہوں شفق کی مسکراہٹ ہے
وہی سورج ہے لیکن اور ہی کچھ جگمگاہٹ ہے
نہ جانے کیسے کیسے پھول اب مجھ کو بلاتے ہیں

نہ جانے کتنے کتنے رنگ سے دل کو لبھاتے ہیں
فضا میں دور تک پھیلے ہوئے وہ کھیت سرسوں کے
یہ کہتے ہیں کہ اب ارماں نکالو اپنے برسوں کے
تمھارے سامنے پھیلا ہوا میدان سارا ہے
تمھارے چاہنے والوں نے پھر تم کو پکارا ہے
کوئی آواز دیتا ہے کہ آؤ تم ہمارے ہو
مری دھرتی کے بیٹے، میری دنیا کے دلارے ہو
تمھاری آنکھ میں جو خواب سوئے ہیں وہ میرے ہیں
تمھارے اشک نے جو بیج بوئے ہیں وہ میرے ہیں
اسی وادی میں پھر سے لوٹ کر اب تم کو آنا ہے
تمھاری ہی یہ بستی ہے، تمھیں کو پھر بسانا ہے
اب اس بستی میں رکھتے ہی قدم کچھ ایسا لگتا ہے
کہ اس کا ذرہ ذرہ، پتہ پتہ کچھ نیا سا ہے
ہر اک رستے پہ جیسے کچھ نئے چہرے سے ملتے ہیں
یہی جی چاہتا ہے جو ملے اب اس سے یہ پوچھیں
تمھارا نام کیا ہے؟ تم کہاں کے رہنے والے ہو
کچھ ایسا جان پڑتا ہے کہ پہلے بھی ملے ہیں ہم
رہے ہیں ساتھ یا اک دوسرے کو جانتے ہیں ہم

اگر تم ساتھ تھے تو تم بھی شاید دوست تھے میرے
مجھے یاد آیا دونوں ساتھ ہی کالج میں پڑھتے تھے
وہ سارے دوستوں کا جمع ہونا میرے کمرے میں
وہ گپ شپ، قہقہے، وہ اپنے اپنے عشق کے قصے
وہ پیرس روڈ کی باتیں، وہ چرچے خوبرویوں کے
کبھی آوارہ گردی اپنی ان ویران سڑکوں کی
کبھی باتوں میں راتیں کاٹنا سنسان جاڑوں کی
کبھی وہ چاندنی میں اپنا یوں ہی گھومتے رہنا
کبھی وہ چائے کی میزوں پہ گھنٹوں بیٹھنا سب کا
وہ باتیں علم و حکمت کی کبھی شکوہ شکایت کی
تمھیں تو یاد ہو گا اُن میں ہی اک دوست شاعر تھا
ذرا دیکھو تو مجھ کو غور سے شاید وہ میں ہی تھا
بہت دن میں ملے ہیں ہم تو آؤ آج جی بھر کر
ہنسیں بولیں، کہیں آوارہ گردی کے لیے نکلیں
چلیں اور چل کے سارے دوستوں کو پھر بلا لائیں
سجائیں آج پھر محفل کہیں پینے پلانے کی
میں تم کو آج اپنی کچھ نئی باتیں بتاؤں گا
میں تم کو آج اپنی کچھ نئی نظمیں سناؤں گا

کنجِ محبّت

یہ سُنسان راتیں، یہ ٹھنڈی ہوائیں، یہ پھیلی ہوئی تیری یادوں کی خوشبو
یہ چپ چاپ سے پیڑ، یہ غم کے سائے، یہ دل کی کسک، یہ محبت کا جادو
یہ سب جاگتے ہیں، یہ سب سوچتے ہیں، یہ سب کروٹیں لے کے ہیں آہ بھرتے
نئی منزلوں سے، نئے راستوں سے، نئے موڑ سے سب کے سب ہیں گزرتے
ہر اک موڑ پر جیسے کوئی کھڑا ہو، اشاروں اشاروں میں کچھ کہہ رہا ہو
سمجھ میں نہ آئے کوئی بات اس کی مگر جیسے چشمہ سا اک بہہ رہا ہو
کوئی جیسے میٹھے مدھر گیت کے بول مدھم سروں میں یوں ہی گنگنائے
کوئی جیسے طوفان دبائے ہو دل میں کسی سے مگر پھر بھی کچھ کہہ نہ پائے
کچھ الفاظ ایسے جو یوں دیکھنے میں پرانے سے ہیں اور کتنے ہی انساں
انھیں کے سہارے سے کہتے رہے ہیں دلوں کی مرادیں، جوانی کے ارماں
یہ ارمان، یہ آرزوئیں ہماری، یہ کچھ رسمساتے ہوئے پھول جیسے
جگائیں جنھیں آکے جھونکے ہوا کے، جنھیں گدگدا جائیں آ آکے بھنورے
خزاں کی ہواؤں کے چلنے سے پہلے، ٹپکتے ہوئے پھول کے رس میں گویا
کوئی گیت سا بُن لیا ہے بہاروں نے گاتے ہیں اب بھی جیسے باغ و صحرا
جو کنجِ محبت میں پیڑوں کی چھنتی ہوئی چاندنی کی زباں سے ہے کہتا
کہو آج کی رات کیسی گزاری؟ کوئی آج کی رات ملنے بھی آیا

بہار کی واپسی

میں چپ چاپ بیٹھا ہوں اس رہگذر پر
یہی سوچتا ہوں کہ خط لانے والا
کہیں آج بھی کہہ نہ دے "کچھ نہیں ہے"
یہ کیا بات ہے لوگ اک دوسرے سے
جدا ہو کے یوں جلد ہیں بھول جاتے
وہ دن رات کا ساتھ ہنسنا ہنسانا
وہ باتیں جنھیں غیر سے کہہ نہ پائیں
اچھوتے سے الفاظ جو شاہراہوں پہ
آتے ہوئے دیر تک ہچکچائیں
کچھ الفاظ کے پھول جو اس چمن میں
کھلے تھے جیسے محفل دوش کھیئے
جو کچھ دیر پہلے ہی برہم ہوئی ہے
چراغوں سے اب تک دھواں اٹھ رہا ہے
در و بام پر اب بھی پھیلی ہوئی ہے
ہر اک سمت صہبائے احمر کی خوشبو
ہواؤں میں ابھی شور ہے ہا و ہو کا

وہ اڑتے ہوئے کاگ کے قہقہوں سے
اُلجھتے ہوئے زمزمے بوتلوں کے
بناتے ہیں دیوار پر کتنے دھبّے
ابھی ہنس رہے ہیں، ابھی بولتے ہیں
مری داستانوں کے دلچسپ کردار
سُنسان گلیوں کے رنگین قصّے
یہ سب تیرے پیچھے چلے آ رہے ہیں
کوئی جیسے روٹھے ہوئے آدمی کو
منائے، بڑے پیار سے تھپتھپائے
دلائے کوئی یاد گزری ہوئی بات
ہاتھوں کو اس کے دبا کر کہے
دیکھنا دیکھنا کوئی انجان راہی ہے
یا لڑکھڑاتا ہوا کوئی پتّہ
خزاں کے پروں پر اُڑا آ رہا ہے
کوئی نامۂ شوق لے آ رہا ہے
ترے شہر سرو سمن کے گلوں نے
خود اپنے ہی ہاتھوں سے تجھ کو لکھا ہے
چلے آؤ اب عہد گل آ گیا ہے

بہت فسردہ ہیں اُن کو کھو کر جگر فگاروں سے کچھ نہ کہنا
نہ جانے کیا ان کے دل پہ بیتے گی سوگواروں سے کچھ نہ کہنا

بہت ہی بھوکے، بہت ہی مفلس، بڑے ہی آوارہ گرد ہیں ہم
بڑے ہی سرکش ہیں جانے کیا کہہ دیں غم کے ماروں سے کچھ نہ کہنا

کبھی نہ بھولیں گی ایسی گھڑیاں، یہ سخت تنہائیوں کے لمحے
گزارنی ہجر کی یہ راتیں مگر ستاروں سے کچھ نہ کہنا

فغاں کہ ایسی فضا میں جینا پڑا ہے جس کا یہ مشورہ ہے
ستم سہے جاؤ لیکن اپنے ستم شعاروں سے کچھ نہ کہنا

یہ کس طرح کی وفا چمن سے ہے کچھ کہو میرے ہمصفیرو!
خزاں سے بڑھ کر جو زہر آگیں ہوں ان بہاروں سے کچھ نہ کہنا

یہ مسکرائے ہیں میرے غم پر تو میری ڈھارس بندھا رہے ہیں
خلوص اک طرح کا ہے ان کو بھی غمگساروں سے کچھ نہ کہنا

جو تیری ساقی گری پہ اکتا کے میکدے سے نکل گئے ہیں
وہ اپنا حق چھین لیں گے اب ایسے میگساروں سے کچھ نہ کہنا

یہ دردِ غربت، یہ اشکِ پیہم، یہ اجنبی شہر کی ہوائیں
مگر جو وہ میرا حال پوچھیں تو میرے پیاروں سے کچھ نہ کہنا

گلی گلی کی ٹھوکر کھائی کب سے خوار و پریشاں ہیں
یاں اپنا ہی ہوش نہیں ہے کس کو چاہ کے ارماں ہیں

فرصت ہو تو آ کے دیکھو ہم آوارہ گردوں کو
کتنے غبار ہیں اس دامن میں، کتنے دل میں طوفاں ہیں

سب ہی ان کا ادب کرتے ہیں چاہنے والا کوئی نہیں
ٹوکا اک گستاخ کو لیکن اب وہ خود ہی پشیماں ہیں

سر جو جھکا اس شوخ کے آگے اور کہیں پھر جھک نہ سکا
مسلکِ مہر و وفا میں واعظ ہم کافر بھی مسلماں ہیں

کچھ کو مداوا کرنا ہو گا اس آشفتہ مزاجی کا
اے غمِ جاناں! اپنے پرائے سب ہی تجھ سے نالاں ہیں

وادی و صحرا چھوڑ کے جب سے تیرے شہر میں آن بسے
جنگل جنگل ڈھونڈتے پھرتے ہم کو سارے غزالاں ہیں

اہلِ زمانہ کو بس میری اک رسوائی یاد رہی
ورنہ میری وفا کے جانے کتنے اور بھی عنواں ہیں

ہم نے اپنی اور سے خوباں کب تم کو بدنام کیا
تم نے جو جو داغ دیے ہیں وہ چھاتی پہ نمایاں ہیں

خیر سے اب کے اہلِ ستم کو دیوانوں سے کام پڑا
دیکھیں کتنی زنجیریں ہیں، دیکھیں کتنے زنداں ہیں

جو پامالِ خزاں ہیں اک دن خاک چمن سے اٹھیں گے
ان کا حشر نہ جانے کیا ہو جو مقتولِ بہاراں ہیں

ڈر نہ رہا موجِ بلا کا، رخ بھی پھرا دنیا کی ہوا کا
رونا کیا ہے دکھ ساگر کا، اس کے ہم پرا حساں ہیں

اک اک بوند جلی ہے لہو کی تب جا کر یہ رات کٹی
تیرے لیے اے صبح طرب ہم کب سے چاک گریباں ہیں

میر کا طرز اپنایا سب نے لیکن یہ انداز کہاں
اعظمی صاحب! آپ کی غزلیں سن کر سب حیراں ہیں

زہر پی کر بھی یہاں کس کو ملی غم سے نجات
ختم ہوتا ہے کہیں سلسلہ رقصِ حیات

آخری شمع ہوں میں میرا لہو جلنے دو
اب مرے بعد ملے گا نہ اندھیروں کو ثبات

صبح سے پہلے ہی برپا نہ کرو خیمۂ گل
کتنے گلچیں ابھی بیٹھے ہیں لگائے ہوئے گھات

ہم کہ میخانے کا میخانہ اٹھا کر پی جائیں
تجھ سے چھٹ کر نہ کٹی ہم سے مگر ایک بھی رات

ضبطِ غم کے تو کئی اور بھی موسم ہوں گے
رو لیں جی بھر کے کہ اب آئے نہ آئے برسات

تشنگی محفلِ خوباں میں تو کیا خاک بجھی
پھر بھی بیٹھا ہوں کہ شاید ہو یہیں آبِ حیات

اتنا باہر نہ قدم سرحدِ ادراک سے رکھ
تجھ کو ڈس لیں نہ کہیں تیرے جنوں کے لمحات

صبح کاذب سے تو کیا چاک ہو ظلمت کی ردا
جگمگا اٹھیں گے اب خاک کے لاکھوں ذرات

تمام یادیں مہک رہی ہیں، ہر ایک غنچہ کھلا ہوا ہے
زمانہ بیتا مگر گماں ہے کہ آج ہی وہ جدا ہوا ہے

یہ سچ ہے کھائے ہیں میں نے دھوکے مگر نہ چاہت سے کوئی روکے
بجھے بجھے سے چراغِ دل میں بھی ایک شعلہ چھپا ہوا ہے

کچھ اور رسوا کرو ابھی مجھ کو تا کوئی پردہ رہ نہ جائے
مجھے محبت نہیں جنوں ہے، جنوں کا کب حق ادا ہوا ہے

میں اور خودسر، میں اور سرکش، ہوا ہوں تلقینِ مصلحت سے
مجھے نہ اس طرح کوئی چھیڑے یہ دل بہت ہی دکھا ہوا ہے

ہزار ناکام ہوں مگر آدمی سے مایوس تو نہیں ہوں
ملے ہیں کتنے رفیق دل کو کبھی جو بے آسرا ہوا ہے

ملا جو اک لمحۂ محبت، یہ پوچھ اس کی ہے کتنی قیمت
اب ایسے لمحوں کا تذکرہ کیا، کبھی جو دو بے وفا ہوا ہے

یہ درد ابھرا ہے عہدِ گل میں خدا کرے جلد رنگ لائے
نہ جانے کب سے سلگ رہا ہے، نہ جانے کب کا دبا ہوا ہے

وفا میں برباد ہو کے بھی آج زندہ رہنے کی سوچتے ہیں
نئے زمانے میں اہلِ دل کا بھی حوصلہ کچھ بڑھا ہوا ہے

ہر ایک لے میری اکھڑی اکھڑی سی دل کا ہر تار جیسے زخمی
یہ کون سی آگ جل رہی ہے یہ میرے نغموں کو کیا ہوا ہے

انتخاب از

نیا عہد نامہ

انتخاب از "نیا عہد نامہ"

وہ دن کب کے بیت گئے جب دل سپنوں سے بہلتا تھا
گھر میں کوئی آئے کہ نہ آئے ایک دیا سا جلتا تھا
یاد آتی ہیں وہ شامیں جب رسم و راہ کسی سے تھی
ہم بے چین سے ہونے لگتے جوں جوں یہ دن ڈھلتا تھا
اُن گلیوں میں اب سنتے ہیں راتیں بھی سو جاتی ہیں
جن گلیوں میں ہم پھرتے تھے جہاں وہ چاند نکلتا تھا
وہ مانوس سلونے چہرے جانے اب کس حال میں ہیں
جن کو دیکھ کے خاک کا ذرّہ ذرّہ آنکھیں ملتا تھا
کوئی پرانا ساتھی بھی شاید ہی ہمیں پہچان سکے
ورنہ اک دن شہرِ وفا میں اپنا سکّہ چلتا تھا
شاید اپنا پیار ہی جھوٹا تھا ورنہ دستور یہ تھا
مٹی میں جو بیج بھی بویا جاتا تھا وہ پھلتا تھا
اب کے ایسی پت جھڑ آئی سوکھ گئی ہے ڈالی ڈالی
ایسے ڈھنگ سے کوئی پودا کب پوشاک بدلتا تھا

آج تو شامِ غم راس آئے اپنی بات بھی رہ جائے
اندھیارے کی کوکھ میں یوں تو پہلے سورج پلتا تھا
دنیا بھر کی رام کہانی کس کس ڈھنگ سے کہہ ڈالی
اپنی کہنے جب بیٹھے تو اک اک لفظ پگھلتا تھا

ہنگامۂ حیات سے جاں بر نہ ہو سکا
یہ دل عجیب دل ہے کہ پتھّر نہ ہو سکا

میرا لہو بھی پی کے نہ دنیا جواں ہوئی
قیمت مرے جنوں کی مرا سر نہ ہو سکا

تیری گلی سے چھُٹ کے نہ جائے اماں ملی
اب کے تو میرا گھر بھی مرا گھر نہ ہو سکا

تیرے نہ ہو سکے تو کسی کے نہ ہو سکے
یہ کاروبارِ شوق مکرّر نہ ہو سکا

یوں جی بہل گیا ہے تیری یاد سے مگر
تیرا خیال تیرے برابر نہ ہو سکا

گزری جو شب تو بجھ گئے اپنے چراغ بھی
آئی سحر تو پھر کوئی رہبر نہ ہو سکا

بہت دنوں میں نے کنج خلوت میں اپنی آواز ہی سنی ہے
مگر مری بانسری فضاؤں سے آج کچھ اور کہہ رہی ہے
بس ایک شعلے کی سرکشی سے چراغ سینے کے جل اُٹھے ہیں
کیا ہے دامن کو چاک میں نے تو آج ہر سمت روشنی ہے
نہ پوچھ مستوں کو زہرِ غم پی کر آج کتنا سرور آیا
نہ دو مے وانگبیں کے ساغر کہ اب مری پیاس بجھ چکی ہے
کسی نگر کا سلام لیتے تو آج کیوں سوگوار ہوتے
وہ کچھ پری رو، کہ جن کے چہروں کی ساری تحریر مٹ چلی ہے
چلو کہ اب غم کی وادیوں میں طلوعِ مہتاب کا سماں
جہاں جہاں میرے اشک برسے وہاں کی مٹی سنور گئی ہے
عدو کو کب حوصلہ تھا اتنا تری محبت کی مار سہتا
ہمیں نے کی ہے یہ پیش دستی ہمیں نے کچھ چھیڑ چھاڑ کی ہے
لگے رہو بازوؤں سے میرے کہ یہ گھڑی پھر بھی ہے غنیمت
ہوا کے جھونکے یہ کہہ رہے ہیں کہ رات آدھی گزر چکی ہے

کوئی تم جیسا تھا، ایسا ہی کوئی چہرا تھا
یاد آتا ہے کہ اک خواب کبھی دیکھا تھا

رات جب دیر تلک چاند نہیں نکلا تھا
میری ہی طرح سے سایہ بھی مرا تنہا تھا

جانے کیا سوچ کے تم نے مرا دل پھیر دیا
میرے پیارے اسی مٹی میں مرا سونا تھا

وہ بھی کم بخت زمانے کی ہوا لے کے گئی
میری آنکھوں میں مری مے کا جو اک قطرہ تھا

تو نہ جاگا مگر اے دل ترے دروازے پر
ایسا لگتا ہے کوئی پچھلے پہر آیا تھا

تیری دیوار کا سایہ نہ خفا ہو مجھ سے
راہ چلتے یوں ہی کچھ دیر کو آ بیٹھا تھا

اے شبِ غم مجھے خوابوں میں سہی دکھلا دے
میرا سورج تری وادی میں کہیں ڈوبا تھا

اک مری آنکھ ہی شبنم سے شرابور رہی
صبح کو ورنہ ہر اک پھول کا منھ سوکھا تھا

تم ذرا تھام لو آکر کبھی پیمانۂ جاں
دیکھو دیکھو مرے ہاتھوں سے ابھی چھوٹا تھا

پینا نہیں حرام، ہے زہرِ وفا کی شرط
آؤ اٹھا دیں آج مئے جاں فزا کی شرط

شوریدگی سر کے لیے سنگ در کی قید
زنجیر غم کے واسطے زلف دوتا کی شرط

ہو دوپہر کی دھوپ تو پلکوں کے سائبان
راتیں گزارنی ہوں تو کالی بلا کی شرط

یہ کیا ضرور، ہو مژۂ عشق خوں فشاں
کیوں دست ناز کے لیے رنگ حنا کی شرط

ہر دلفگار کے لیے کیوں چاک پیرہن
ہر دلنواز کے لیے بند قبا کی شرط

کیا فرض ہے کہ ہم بھی بنیں قیس عامری
راہ جنوں میں کیوں ہو کسی نقش پا کی شرط

کیوں دل کے توڑنے کو کہیں رسم دلبری
کیوں ہو کسی سے وعدۂ صبر آزما کی شرط

کیوں ہو کسی کو کوچۂ قاتل کی جستجو
کیوں امتحاں کے واسطے تیغِ جفا کی شرط
کیوں زندگی کو جبرِ مسلسل کا نام دیں
کیوں آرزوئے موت کو دستِ دعا کی شرط
کیوں ہر گھڑی زباں پہ ہو جرم و سزا کا ذکر
کیوں ہر عمل کی فکر میں خوفِ خدا کی شرط
ہم نے خود اپنے آپ زمانے کی سیر کی
ہم، کہ قبول کی نہ کسی رہنما کی شرط

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر! ذرا پکار مجھے

میں اپنے گھر کو بلندی پہ چڑھ کے کیا دیکھوں
عروجِ فن! مری دہلیز پر اتار مجھے

اُبلتے دیکھی ہے سورج سے میں نے تاریکی
نہ راس آئے گی یہ صبحِ زرنگار مجھے

کہے گا دل تو میں پتھر کے پاؤں چوموں گا
زمانہ لاکھ کرے آ کے سنگسار مجھے

وہ فاقہ مست ہوں جس راہ سے گزرتا ہوں
سلام کرتا ہے آشوبِ روزگار مجھے

وہ رنگِ رُخ، وہ آتشِ خوں کون لے گیا
اے دل ترا وہ رقصِ جنوں کون لے گیا
زنجیرِ آنسوؤں کی کہاں ٹوٹ کر گری
وہ انتہائے غم کا سکوں کون لے گیا
دردِ نہاں کے چھین لیے کس نے آئینے
نوکِ مژہ سے قطرۂ خوں کون لے گیا
جو مجھ سے بولتی تھیں وہ راتیں کہاں گئیں
جو جاگتا تھا سوزِ دروں کون لے گیا
کس موڑ پر بچھڑ گئے خوابوں کے قافلے
وہ منزلِ طرب کا فسوں کون لے گیا
جو شمع اتنی رات جلی کیوں وہ بجھ گئی
جو شوق ہو چلا تھا فزوں کون لے گیا

کہوں یہ کیسے کہ جینے کا حوصلہ دیتے
مگر یہی کہ مجھے غم کوئی نیا دیتے

شب گزشتہ بہت تیز چل رہی تھی ہوا
صدا تو دی پہ کہاں تک تجھے صدا دیتے

کئی زمانے اسی پیچ و تاب میں گزرے
کہ آسماں کو ترے پاؤں پر جھکا دیتے

یہ کہیے لوحِ جبیں پر رہے داغِ رسوائی
زمانے والے ہمیں خاک میں ملا دیتے

ہوئی تھی ہم سے جو لغزش تو تھام لینا تھا
ہمارے ہاتھ تمہیں عمر بھر دعا دیتے

بھلا ہوا کہ کوئی اور مل گیا تم سا
وگرنہ ہم بھی کسی دن تمہیں بھلا دیتے

کوئی ہو لمحۂ فرصت کہ بیٹھ کر ہم بھی
ذرا عروسِ تمنا کو آئینہ دیتے

ملا ہے جرمِ وفا پر عذابِ مہجوری
ہم اپنے آپ کو اس سے کڑی سزا دیتے
زباں پہ کس لیے یہ حرفِ ناگوار آتا
ہمارے زخم ہمارا اگر پتا دیتے
ذرا سی دیر ٹھہرتی جو گردشِ ایام
اسے شبابِ گریزاں کا واسطا دیتے

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں
سایہ سا یہ پکارتا ہوں

سونا ہوں کُرید کر تو دیکھو
مٹی میں دبا ہوا پڑا ہوں

لے مجھ کو سنبھال گردشِ وقت!
ٹوٹا ہوا تیرا آئینا ہوں

یوں ربط تو ہے نشاط سے بھی
دراصل میں غم سے آشنا ہوں

صحبت میں گلوں کی میں بھی رہ کر
کانٹوں کی زباں سمجھ گیا ہوں

دشمن ہو کوئی کہ دوست میرا
ہر ایک کے حق میں، میں دعا ہوں

کیوں آبِ حیات کو میں ترسوں
میں زہرِ حیات پی چکا ہوں
تقدیرِ جنوں پہ چپ رہا میں
تعبیرِ جنوں پہ رو رہا ہوں
ہر عہد کے لوگ مجھ سے ناخوش
ہر عہد میں خواب دیکھتا ہوں

بن باس

میں کہ خود اپنی ہی آواز کے شعلوں کا اسیر
میں کہ خود اپنی ہی زنجیر کا زندانی ہوں
کون سمجھے گا جہاں میں مرے زخموں کا حساب
کس کو خوش آئے گا اس دہر میں روحوں کا عذاب
کون آکر مرے مٹنے کا تماشا دیکھے
کس کو فرصت کہ اجڑتی ہوئی دنیا دیکھے
کون بھڑکی ہوئی اس آگ کو اپنائے گا
جو بھی آئے گا مرے ساتھ ہی جل جائے گا
وہ گھڑی کون تھی جب مجھ کو ملا تھا بن باس
ایک جھونکا بھی ہوا کا نہ وطن سے آیا
نے کوئی نکہت گل اور نہ کوئی موجِ نسیم
پھر کوئی ڈھونڈنے مجھ کو نہ چمن سے آیا
میں وہ اک لعل ہوں جو بک گیا بازاروں میں
پھر کوئی پوچھنے مجھ کو نہ یمن سے آیا

یاد کرتے ہوئے اک یوسفِ گم گشتہ کو
کچھ دنوں روئی تو ہوگی مرے گھر کی دیوار
کچھ دنوں گاؤں کی گلیوں میں اُداسی ہوگی
کچھ دنوں کھل نہ سکے ہوں گے مرے ہارسنگھار
کچھ دنوں کے لیے سُنسان سا لگتا ہوگا
آم کے باغ میں بے چین پھری ہوگی بہار
میں نے اک پیڑ پہ جو نام لکھا تھا اپنا
کچھ دنوں زخم کے مانند وہ تازہ ہوگا
میرے سب دوست اسے دیکھ کے کہتے ہوں گے
جانے کس دیس میں بے چارہ بھٹکتا ہوگا
عمر بھر کون کسے یاد کیا کرتا ہے
ایک اک کر کے مجھے سب نے بھلایا ہوگا
ہائے ان کو بھی خبر کیا کہ وہ اک زخم نصیب
زندگی کے لیے نکلا تھا جو راہی بن کر
آج تک پا نہ سکا چشمۂ آبِ حیواں
اس کو سورج بھی ملے ہیں تو سیاہی بن کر
گھر سے لایا تھا جو کچھ طبع رواں، ذہن رسا
ساتھ اس کے رہے اسبابِ تباہی بن کر

میرا یہ جرم کہ میں صاحبِ ادراک و شعور
میرا یہ عیب کہ اک شاعر و فنکار ہوں میں
مجھ کو یہ ضد ہے کہ میں سر نہ جھکاؤں گا کبھی
مجھ کو اصرار کہ جینے کا سزاوار ہوں میں
مجھ کو یہ فخر کہ میں حق و صداقت کا امیں
مجھ کو یہ زعم خود آگاہ ہوں خوددار ہوں میں
ایک اک موڑ پہ آلام و مصائب کے پہاڑ
ایک اک گام پہ آفات سے ٹکرایا ہوں
ایک اک زہر کو ہنس ہنس کے پیا ہے میں نے
ایک اک زخم کو چن چن کے اُٹھا لایا ہوں
ایک اک لمحے کی زنجیر سے میں اُلجھا ہوں
ایک اک سانس پہ خود آپ سے شرمایا ہوں
یوں تو کہنے کی نہیں بات مگر کہتا ہوں
پیار کا نام کتابوں میں لکھا دیکھا ہے
جب کبھی ہاتھ بڑھایا ہے کسی کی جانب
فاصلہ اور بھی کچھ بڑھتا ہوا دیکھا ہے
بوند بھر دے نہ سکا کوئی محبت کی شراب
یوں تو میخانہ کا میخانہ لٹا دیکھا ہے

سایۂ دیوار

کیا سُنسان ہے دشتِ آوارگی
ہر طرف دھوپ ہے ہر طرف تشنگی
کیسی بے جان ہے میکدے کی فضا
جسم کی سنسنی، روح کی خستگی

اس دوراہے پہ کھوئے گئے حوصلے
اس اندھیرے میں گم ہو گئی زندگی
اے غمِ آرزو میں بہت تھک گیا
مجھ کو دے دے وہی میری اپنی گلی

چھوٹا موٹا مگر خوبصورت سا گھر
گھر کے آنگن میں خوشبو سی پھیلی ہوئی
منہ دھلاتی سویرے کی پہلی کرن
سائباں اور بیل مہکی ہوئی
کھڑکیوں پر ہواؤں کی اٹکھیلیاں
روزنِ در سے چھنتی ہوئی روشنی

شام کو ہلکا ہلکا سا اٹھتا دھواں
پاس چولھے کے بیٹھی ہوئی لکشمی
ایک انگیٹھی میں کوئلے دہکتے ہوئے
برتنوں کی سُہانی مدھر راگنی
رس بھرے گیت معصوم سے قہقہے
رات کو چھت پہ چھٹکی ہوئی چاندنی
صبح کو اپنے اسکول جاتے ہوئے
میرے ننھے کے چہرے پہ اک تازگی
رشتے ناطے، ملاقاتیں، مہمانیاں
دعوتیں، جشن تیوہار، شادی غمی
جی میں ہے اپنی آزادیاں بیچ کر
آج لے لوں یہ پابندیوں کی خوشی

اپنے بچّے کے نام

اے مرے جسم و جاں کے حاصل
میرے آنگن کے نو دمیدہ گلاب
میرے معصوم خواب کے ہم شکل
میری مریم کے سایۂ شاداب
صبحِ تخلیق کا سلام تجھے
زندگی تجھ کو کہتی ہے آداب
اے مقدس زمیں کے شعلۂ نو
تو فروزاں ہو اُن فضاؤں میں
میرے سینے کی جو امانت ہیں
جو مری نارسا دعاؤں میں
اس طرح مسکراتی ہے جیسے
نغمگی دور کی صداؤں میں

مجھ کو اجداد سے وراثت میں
وہ خرابے ملے کہ جن میں رہا
عمر بھر پائمال و خاک بسر
میرا حصّہ رہا غمِ فردا
مجھ کو میرے لہو میں نہلا کر
جس نے قیدِ حیات میں رکھا
اے مری روحِ فن کے عکسِ جمیل
تجھ کو میری سی زندگی نہ ملے
جو نہ میں ہو سکا وہ تو ہو جائے
کاش تو میرا جانشیں نہ بنے
میں تصور میں بھی جہاں نہ گیا
اُن دیاروں میں تیرا نام چلے

شام

خوبصورت شام کہتی ہے کہ آؤ اب چلیں
چل کے ان رستوں پہ ڈھونڈیں اپنی کچھ پرچھائیاں
کل جہاں چھوڑا تھا ہم نے رنگ و بو کا کارواں
چل کے پہچانیں کہ ان میں اپنی قبریں کون ہیں
اس خرابے میں پڑے ہیں جا بجا مٹی کے ڈھیر
جس کی قسمت کو نہ راس آیا دنوں کا ہیر پھیر
کتنی شامیں میں نے رو رو کر گزاری ہیں یہاں
کر چکا ہوں بارہا آ کر یہاں پر خودکشی
یہ زمیں میرا لہو پی کر بھی ویسی ہی رہی
پھر کہیں یہ شام بھی جائے نہ اپنی رائگاں
آج یہ چل کر اپنے قدموں سے یہ قبریں روند دیں
شاید اب کی فصل میں اس خاک سے پودے اگیں

رفتگاں

دروازے اداس اور گم سُم
دہلیز کو چپ سی لگ گئی ہے
کیوں دور سے ان کے قہقہوں کی
آتی نہیں آج کوئی آواز
اب کوئی نہ انگلیوں کی جھنکار
نے قدموں کی کوئی راگنی ہے
کس حال میں ہیں یہ کون جانے
سب اپنے وہ ہم سبق وہ ساتھی
کہہ کر تو گئے تھے پھر ملیں گے
کیا جانیے ان پہ کیسی بیتی
آوارہ ہے کون اب بھی پھرتا
راس آگئی کس کو گھر گرہستی

آتے ہیں بہت سے آنے والے
کچھ اجنبی، کچھ رفیق و ہمدم
لیکن کئی سال مجھ پہ گزرے
سننے کے لیے ترس گیا ہوں
دستک، کہ جواب بھی جانتی ہو
وہ نام جو میرا پیار کا ہے

سوداگر

لو گجر بج گیا
صبح ہونے کو ہے
دن نکلتے ہی اب میں چلا جاؤں گا
اجنبی شاہراہوں پہ پھر
کاسۂ چشم لے کے ایک ایک چہرہ تکوں گا
دفتروں کارخانوں میں، تعلیم گاہوں میں جاکر
اپنی قیمت لگانے کی کوشش کروں گا

میری آرام جاں!
مجھ کو اک بار پھر دیکھ لو
آج کی شام لوٹوں گا جب
بیچ کر اپنے شفاّف دل کا لہو
اپنی جھولی میں چاندی کے ٹکڑے لیے
تم بھی مجھ کو نہ پہچان پائیں تو پھر
میں کہاں جاؤں گا۔؟
کس سے جاکر کہوں گا کہ میں کون تھا ـــــ
کس سے جاکر کہوں گا کہ میں کون ہوں ـــــ

نیا عہد نامہ

برسوں سے یہ بام و در کہ جن پر
مہکی ہوئی صبح کے ہیں بوسے
یادوں کے یہی نگر کہ جن پر
سجتے ہیں یہ شام کے دھندلکے
یہ موڑ یہ رہ گزر کہ جن پر
لگتے ہیں اداسیوں کے میلے
ہیں میرے عزیز، میرے ساتھی
کب سے میرا آسرا رہے ہیں
سنتے ہیں یہ میرے دل کی دھڑکن
جیسے یہ مجھے سکھا رہے ہیں
ہنس بول کے عمر کاٹ دینا
میرے یہی دست و پا رہے ہیں
برسوں سے یہ میری زندگی ہیں
برسوں سے میں ان کو جانتا ہوں
ہیں میری وفا پہ یہ بھی نازاں
ہر بات میں اُن کی مانتا ہوں

لیکن مرے دل کو کیا ہوا ہے
میں آج کچھ اور ٹھانتا ہوں
لگتا ہے یہ شہرِ دلبراں بھی
ہے پاؤں کی میرے کوئی زنجیر
بس ایک ہی رات ایک دن ہے
ہر روز وہی پرانی تصویر
ہر صبح وہی پرانے چہرے
ہو جاتے ہیں شام کو جو دل گیر
اب اور کہیں سے چل کے دیکھیں
کس طرح سحر کی نرم کلیاں
کرنوں کا سلام لے رہی ہیں
جاگ اٹھتی ہیں کس طرح سے گلیاں
سب کام پہ ایسے جا رہے ہیں
جیسے کہ منائیں رنگ رلیاں
دیکھیں کہیں شام کو نکل کر
ڈھلتے ہوئے اجنبی سے سائے
یوں ہاتھ میں ہاتھ لے رہے ہوں
جیسے کہیں گھاس سرسرائے

اس طرح سے پاؤں چل رہے ہوں
جیسے کوئی پی کے لڑکھڑائے
آنے ہی کو ہوں ملن کی گھڑیاں
سورج کہیں غم کا ڈوبتا ہو
مہکی ہو کہیں پہ شب کی دلہن
کچنار کہیں پہ کھل رہا ہو
ہر گام پہ اک نیا ہو عالم
ہر موڑ پہ اک نیا خدا ہو

انتخاب از

زندگی اے زندگی

انتخاب از "زندگی اے زندگی"

خود اپنا عکس ہوں کہ کسی کی صدا ہوں میں
یوں شہر تا بہ شہر جو بکھرا ہوا ہوں میں

میں ڈھونڈنے چلا ہوں جو خود اپنے آپ کو
تہمت یہ مجھ پہ ہے کہ بہت خود نما ہوں میں

مجھ سے نہ پوچھ نام مرا روحِ کائنات
اب اور کچھ نہیں ہوں ترا آئینہ ہوں میں

جب نیند آگئی ہو صدائے جرس کو بھی
میری خطا یہی ہے کہ کیوں جاگتا ہوں میں

لاؤں کہاں سے ڈھونڈھ کے میں اپنا ہمنوا
خود اپنے ہر خیال سے ٹکرا چکا ہوں میں

اے عمرِ رفتہ میں تجھے پہچانتا نہیں
اب مجھ کو بھول جا کہ بہت بے وفا ہوں میں

سوتے سوتے چونک پڑے ہم خواب میں ہم نے کیا دیکھا
جو خود ہم کو ڈھونڈ رہا ہو ایسا اک رستا دیکھا

دور سے اک پرچھائیں دیکھی اپنے سے ملتی جلتی
پاس سے اپنے چہرے میں بھی اور کوئی چہرہ دیکھا

سونا لینے جب نکلے تو ہر ہر ڈھیر میں مٹی تھی
جب مٹی کی کھوج میں نکلے سونا ہی سونا دیکھا

سوکھی دھرتی سن لیتی ہے پانی کی آواز دل کو
پیاسی آنکھیں بول اٹھتی ہیں ہم نے اک دریا دیکھا

آج ہمیں خود اپنے اشکوں کی قیمت معلوم ہوئی
اپنی چتا میں اپنے آپ کو جب ہم نے جلتا دیکھا

چاندی کے سے جن کے بدن تھے سورج کے سے مکھڑے تھے
کچھ اندھی گلیوں میں ہم نے ان کا بھی سایہ دیکھا

ہر ہر سانس نئی خوشبو کی اک آہٹ سی پاتا ہے
اک اک لمحہ اپنے ہاتھ سے جیسے نکلا جاتا ہے

دن ڈھلنے پر نس نس میں جب گرد سی جمنے لگتی ہے
کوئی آ کر میرے لہو میں پھر مجھ کو نہلاتا ہے

ساری ساری رات جلے ہیں جو اپنی تنہائی میں
ان کی آگ سے صبح کا سورج اپنا دیا جلاتا ہے

میں تو گھر میں اپنے آپ سے باتیں کرنے بیٹھا تھا
اَن دیکھا سا اک چہرہ دیوار پہ ابھرا آتا ہے

کتنے سوال ہیں اب بھی ایسے جن کا کوئی جواب نہیں
پوچھنے والا پوچھ کے ان کو اپنا دل بہلاتا ہے

کس کو سزائے موت ملے گی؟ یہ کیسی ہے بھیڑ لگی
اور کیا اُس نے جرم کیا تھا؟ کوئی نہیں بتلاتا ہے

ہر گھڑی عمرِ فرومایہ کی قیمت مانگے
مجھ سے آئینہ مرا میرا ہی صورت مانگے

دور رہ کر ہی جو آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں
دلِ دیوانہ مگر ان کی ہی قربت مانگے

پوچھتے کیا ہو ان آنکھوں کی اداسی کا سبب
خواب جو دیکھے وہ خوابوں کی حقیقت مانگے

اپنے دامن میں چھپا لے مرے اشکوں کے چراغ
اور کیا تجھ سے کوئی اے شبِ فرقت مانگے

وہ نگہ کہتی ہے بیٹھے رہو محفل میں ابھی
دل کی آشفتگی اٹھنے کی اجازت مانگے

زہر پی کر بھی جیوں میں یہ الگ بات مگر
زندگی اس لبِ رنگیں کی حلاوت مانگے

زیب دیتے نہیں یہ طرّہ و دستار مجھے
میری شوریدہ سری سنگِ ملامت مانگے

کیا قیامت ہے کہ ہم خود ہی کہیں خود ہی سنیں
ایک سے ایک ابوجہل ہے کس کس سے لڑیں

اور تو کوئی بتاتا ہی نہیں اس شہر کا حال
اشتہارات ہی دیوار کے پڑھ کر دیکھیں

یاں تو سب لوگ ہیں دستارِ فضیلت باندھے
کوئی ہم سا جو ہو محفل میں تو ہم بھی بیٹھیں

جتنے ساتھی تھے وہ اس بھیڑ میں سب کھو سے گئے
اب تو سب ایک سے لگتے ہیں کسے ہم ڈھونڈیں

گھر کی ویرانی طلب کرتی ہے دن بھر کا حساب
ہم کو یہ فکر ذرا شام کو باہر نکلیں

خواب دیکھے نہیں خوابوں کی تمنا کی ہے
رات کس طرح سے کاٹی ہے یہ کیا عرض کریں

حاصلِ عمر بس اک کاسۂ خالی کیوں ہو
اور کچھ بس نہ چلے زہر سے اس کو بھر لیں

ہم سے کیوں پوچھتے ہیں وقت کی رفتار کا حال
آپ کیوں خود ہی نہ مسند سے اتر کر دیکھیں

دل پہ اک بوجھ سا رکھا ہے کسی طور ہٹے
ورق سادہ میسر ہو تو ہم بھی لکھیں

بنے بنائے سے رستوں کا سلسلہ نکلا
نیا سفر بھی بہت ہی گریز پا نکلا
نہ جانے کس کی ہمیں عمر بھر تلاش رہی
جسے قریب سے دیکھا وہ دوسرا نکلا

ہمیں تو راس نہ آئی کسی کی محفل بھی
کوئی خدا کوئی ہمسایۂ خدا نکلا

ہزار طرح کی مے پی ہزار طرح کے زہر
نہ پیاس ہی بجھی اپنی نہ حوصلہ نکلا

ہمارے پاس سے گزری تھی ایک پرچھائیں
پکارا ہم نے تو صدیوں کا فاصلہ نکلا

اب اپنے آپ کو ڈھونڈیں کہاں کہاں جاکر
عدم سے تا بہ عدم اپنا نقشِ پا نکلا

کیوں میں بے حس بن کے اوروں کی طرح سے زندہ ہوں
کیا بتاؤں میں خود اپنے آپ سے شرمندہ ہوں

قرض سب باقی پڑا ہے لمحۂ موجود کا
کیوں سراپا انتظارِ لمحۂ آئندہ ہوں

ایسا اب کوئی نہیں جس پر کردوں سب کچھ نثار
اب تو برسوں سے خود اپنے سایے میں رقصندہ ہوں

رنگ چہروں کے، چراغ آنکھوں کے دھندلے پڑ گئے
عکس کس کا دل میں ہے جس کے لیے نالندہ ہوں

میں نہیں صاحبانِ دست و بازوں کا حریف
اک زہرِ آگہی صد نعمتِ بخشندہ ہوں

حروف والفاظ کے ذخیرے

حروف والفاظ کے ذخیرے
یہی ہیں وہ دائرے
کہ جن میں اسیر تم بھی ہو اور میں بھی
تمھارا جو نام
چند حرفوں سے مل کے بنتا ہے
چاہے مفہوم اس کا کچھ بھی ہو
چاہے مفہوم سے وہ خالی ہو
چاہے اس کیفیت کے برعکس ہو
جو تم میں نمود پاتی ہے
ایسی اک رُوح
جو کسی جسم میں
کسی آئینہ میں اتری ہو
ایک پیکر میں ڈھل گئی ہو
مرا بھی اک نام ہے
اسی نام سے لوگ مجھے جانتے ہیں

یہ نام بھی
چند الفاظ کو ملانے سے بن گیا ہے
اب اس کا کیا ذکر مجھ پہ یہ کتنا سج رہا ہے
تو کیا ہمارا اُتھار اسمبندھ اتنا ہی ہے
کہ چند الفاظ
چند الفاظ سے مل رہے ہیں
مگر اسی نام کے تو کچھ اور لوگ ہوں گے
اگر نہ ہوں گے تو کل اسی نام کے اور کئی لوگ ہوں گے
اگر ہمارا وجود ان سے کچھ ماورا ہے
حروف و الفاظ سے سوا ہے
تو اس کے اظہار کا اور ڈھنگ کیا ہے

میں گوتم نہیں ہوں

میں گوتم نہیں ہوں
مگر میں بھی جب گھر سے نکلا تھا
یہ سوچتا تھا
کہ میں اپنے ہی آپ کو
ڈھونڈنے جا رہا ہوں
کسی پیڑ کی چھاؤں میں
میں بھی بیٹھوں گا
اک دن مجھے بھی
کوئی گیان ہوگا
مگر جسم کی آگ
جو گھر سے لے کر چلا تھا
سلگتی رہی
گھر سے باہر ہوا تیز تھی
اور بھی یہ بھڑکتی رہی

ایک اک پیڑ جل کر ہوا راکھ
میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں
جہاں میں ہی میں ہوں
جہاں میرا سایہ ہے
سائے کا سایہ ہے
اور دور تک
بس خلا ہی خلا ہے

آئینہ در آئینہ

میں آج سویرے جاگ اٹھا
دیکھا کہ ہے ہر سو سنّاٹا
چپ چاپ ہے سارا گھر آنگن
باہر سے بند ہے دروازہ
سب بھائی بہن بیوی بچّے
آخر ہیں کہاں؟ ہے کیا قصّہ
اتنے میں عجب اک بات ہوئی
ناگاہ جو دیکھا آئینہ
اک آدمی مجھ کو آیا نظر
مجھ سے ہی مگر ملتا جلتا
دو سینگ ہیں اس کے سر پہ اُگے
یہ دیو ہے کوئی یا دیوتا
تم کون ہو؟ یہ پوچھا میں نے
پر کوئی نہ مجھ کو جواب ملا
میں کانپ اٹھا تھر تھر تھر تھر

سوچا کہ کروں جھک کر سجدہ
اتنے میں ہوئی اک آہٹ سی
میں سن کے یکایک چونک اٹھا
اب دیر ہوئی اٹھئے پاپا
ہاں مجھ کو دفتر جانا ہے
اس خواب کا لیکن کیا ہوگا۔

میں کہاں ہوں کچھ بتا دے زندگی اے زندگی!
پھر صدا اپنی سنا دے زندگی اے زندگی!

سو گئے ایک ایک کر کے خانۂ دل کے چراغ
ان چراغوں کو جگا دے زندگی اے زندگی!

وہ بساطِ شعر و نغمہ، رت جگے وہ چہچہے
پھر وہی محفل سجا دے زندگی اے زندگی!

جس کے ہر قطرے سے رگ رگ میں مچلتا تھا لہو
پھر وہی اک شے پلا دے زندگی اے زندگی!

اب تو یاد آتا نہیں کیسا تھا اپنا رنگ روپ
پھر مری صورت دکھا دے زندگی اے زندگی!

ایک مدّت ہو گئی روٹھا ہوں اپنے آپ سے
پھر مجھے مجھ سے ملادے زندگی اے زندگی!
جانے برگشتہ ہے کیوں مجھ سے زمانے کی ہوا
اپنے دامن کی ہوا دے زندگی اے زندگی!
رچ گیا ہے میری نس نس میں مری راتوں کا زہر
میرے سورج کو بُلادے زندگی اے زندگی!

پھر مری راہ میں کھڑی ہوگی
وہی اک شے جو اجنبی ہوگی

شور سا ہے لہو کے دریا میں
کس کی آواز آ رہی ہوگی

پھر مری روح میرے گھر کا پتہ
مرے سائے سے پوچھتی ہوگی

کچھ نہیں میری زرد آنکھوں میں
ڈوبتے دن کی روشنی ہوگی

رات پھر دل سے بس یہی باتیں
دن کو پھر درد میں کمی ہوگی

بس یہی ایک بوند آنسو کی
میرے حصّے کی رہ گئی ہوگی

پھر مرے انتظار میں مری نیند
میرے بستر پہ جاگتی ہوگی

جانے کیوں اک خیال سا آیا
میں نہ ہوں گا تو کیا کمی ہوگی

اگرچہ غیر کے ہاتھوں لہو لہان ہوا
مگر میں اپنی طرف سے بھی بدگمان ہوا

جو پڑ گیا تھا کبھی خود مری نگاہوں پر
وہ ایک پردہ مرے حق میں آسمان ہوا

وہ جس کے واسطے دنیا تھی گوش برآواز
وہ ماجرا مری آنکھوں ہی سے بیان ہوا

تلاش اُس کی تھی مقصود، دیر و کعبہ کیا
ہمارا رُخ تھا جدھر اُس کا اک نشان ہوا

ہمارے ظرف کو کیا آزماتے اہلِ ہوس
اسی بہانے خود ان کا بھی امتحان ہوا

بہت ملول تھے جس دامن دریدہ پر
وہی سفینۂ ہستی کا بادبان ہوا
ازل سے تھا وہ ہمارے وجود کا حصّہ
وہ ایک شخص کہ جو ہم پہ مہربان ہوا
ذرا جو تیز چلے ہم تو کوئی ساتھ نہ تھا
حصارِ فکر ہی بس اپنا پاسبان ہوا

مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات

کے موقع پر

اتر پردیش اردو اکادمی کی عظیم پیش کش

چار ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل

مولانا آزاد کے مشہور زمانہ جریدے

الہلال

کی مکمّل فائلوں کا عکسی ایڈیشن

(اس میں البلاغ کی جلد بھی شامل ہے)

مقدمہ

ڈاکٹر محمود الٰہی

سائز ۲۰×۳۰/۴ | ریکسین کی پختہ جلد | نفیس کاغذ

قیمت

(مکمّل سیٹ تین حصوں میں)

۶۰۰/- روپے

Only Cover Printed at : Faran Printing Press, Chowk, Lko-3